OPEN ACCESS
Al-Nasr
ISSN (Online): 2958-9398
ISSN (Print): 2959-1015
https://alnasrjournal.com

اقوالِ فقہاء میں ترجیح کے اصول: فقہ حنفی کے تناظر میں ایک مطالعہ

Principles of Priority in the Sayings of Jurists: A Study from the Context of Hanafi Jurisprudence

Muhammad Sher Zaman
PHD Research Scholar, AIOU
Hafiz Muhammad Awan
Visiting Lecturer, University of Sargodha

Abstract

While giving a fatwa in jurisprudence, Mufti Muqlid will give a fatwa on the religion of the Ashab e Tarjeeh. Ashab e Tarjeeh are silent on an issue, He will give preference to one opinion over another opinion in the fatwa through priority of adherence. There are different forms of preference of adherence. Some of them are: When there are two sayings or two hadiths narrated from Imam Abu Hanifa in any issue, then the one which is later will be taken or the one whose adoption is proved by Imam Abu Hanifa himself, and if there is a saying from Imam Abu Hanifa. If the preference is not proven, then the one that was adopted by Imam Abu Yusuf will be followed. Then the saying or tradition that was adopted by Imam Muhammad will be followed. Zofar and Imam Hassan bin Ziyad have given authority. If there is a difference between the preference of Imam Abu Hanifah and the Sahbain, then we will see if the mufti is qualified for ijtihad, then he will be given authority, and if he is not among the people of ijtihad, then Imam He will accept the opinion of Abu hnifah. From the words of Allama Ibn Najeem, it is known that when one of the Sahibs agrees with Imam Abu Hanifa, then the

CC BY

opinion of Imam Abu Hanifa will be valid. If there are different views, then Mufti Mujtahid has the authority and Mufti who is not Mujtahid must follow the opinion of Imam Abu Hanifa. Yes, if the basis of disagreement is Sabba-e-Sita, then the words of the Sahibin will be followed. Admitting Sabba-e-Sita is mandatory for a mufti.

Key Words: Mufti Muqlid, *jurisprudence Ashab e Tarjeeh*

تمہید

اسلامی تعلیمات میں قرآن وحدیث کے بعد فقہ کا مرتبہ ہے، بعض قرآنی احکام کی تشریح دوسری آیات سے میسر ہے جبکہ کئی آیات کی وضاحت احادیث سے ثابت ہے جبکہ بعض آیات اور کئی احادیث کی وضاحت کے لئے استدلال کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ دور تابعین میں ہی فقہ کی بنیاد رکھی گئی، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں اسلامی تعلیمات کی تشریحات وتوضیحات پر خوب ابحاث ہوئیں جو کہ بعد میں باقاعدہ مدون ہوئیں۔ ویسے تو قرآن وحدیث کے سمجھنے کو فقہ کہتے ہیں لیکن اہل علم خاص استدلالی اور قیاسی مسائل کو فقہ کا نام دیتے ہیں۔ دوسری تیسری صدی ہجری علم فقہ کے تدوین وارتقا کا دور ہے۔ الفاظ کے معانی وتعبیر کے اعتبار سے اور نئے پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات کے دلائل میں فقہا میں اختلاف جاری ہوا، اس کی واضح مثال لفظ قروء کی وجہ آیت سے ثابت ہونے والے حکم کا اختلاف ہے، پھر اکراہ اور عموم بلوی کی وجہ سے احکام میں رخصت اور پھر دلائل کے صحت وسقم کے اعتبار سے احکام کا مختلف ہوئے اور ان کی درجہ بندی کی گئی۔ فقہ کے چار بڑے مسالک دلائل کے اختلاف کی وجہ سے ترتیب پائے اور پھر ان سب میں زمانے کے اعتبار سے مقدم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت ہیں اور ان کی مدون کی گئی فقہ کے پیروکار بھی دیگر ائمہ کی نسبت زیادہ ہیں۔ فقہ حنفی میں بھی دلائل اور اسباب وعلل کے سبب فقہا میں اختلاف واقع ہوا پھر ہر دور کے فقہ حنفی کے فقہا نے مسائل کی تبیین اور ان کے اسباب وعلل پر تفصیلا تحریر وتصنیف کا میدان سجایا اسی وجہ سے فقہا کے مختلف طبقات ترتیب دیئے گئے، ان علمانے جن وجوہ واسباب کے پیش نظر احکام بیان کئے وہ احکام قابل عمل ہوں گے یا مرور زمانہ ودیگر علل کے پیش نظر نا قابل عمل ہوں گے اور پھر فقہائے احناف نے قابل عمل احکام کے دلائل کے ضعیف وقوی ہونے کے سبب احکام کی درجہ بندی کی اور ان احکام کو بیان کرنے کے لئے مخصوص الفاظ کا چناؤ کیا یہ الفاظ فقہا کے اقوال کہلائے۔ زیر نظر مقالہ میں ان اقوال کو زیر بحث لایا گیا ہے کہ کون سے اقوال راجح ہیں اور کون سے مرجوح ہیں اور ان کی وجوہ ترجیح پر بھی بحث کی گئی ہے۔ قواعد اور اقوال کی مدد سے کسی حد تک اقوال مرجحہ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقوالِ فقہاء

جب کسی مسئلہ میں سب ائمہ کرام کسی ایک قول / رائے پر متفق ہوں، تو اس صورت میں اسی قول کو لیا جاتا ہے۔[1] خواہ وہ مسئلہ ظاہر الروایۃ میں مذکور ہو یا نوادر میں یا واقعات وفتاوی میں۔ ہاں صرف ایک صورت ہے کہ جب بدیہی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مسئلہ کسی علت پر مبنی تھا اور اب وہ علت ختم ہو چکی ہے۔ تو اب اس مسئلہ میں اتفاقِ ائمہ کے باوجود اعراض کر سکتے ہیں۔ اسی طرح زمانہ کی وجہ سے بھی احکام میں تبدیلی کی جاتی ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے زمانہ کی وجہ سے احکام میں تبدیلی کی چار وجوہ بیان کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"وانما يقع هذاالتغير بأحد الوجوه الاربعة الآتية :الاول :ان يكون الحكم معلولا بعلة فان فاتت العلة بتغير الزمان ،تغير بتغير الزمان الحكم

بفواتها۔والثانی :ان یکون الحکم مبنیا علی العرف و العادۃ ،فلو تغیر العرف تغیر الحکم ۔وھذا فی الحقیقۃ یرجع الی الوجہ الاول ،لان تغیر العرف انما یغیر الحکم ان کان الحکم السابق معلولا بالعرف۔والثالث:ان تغیر الحکم لضرورۃ شدیدۃ او لعموم البلوی ۔و یقع التغیر بقدر الضرورۃ ۔والرابع :ان یتغیر الحکم لسدالذرائع۔"[2]

تغیر زمانہ کی وجہ سے مسائل میں یہ تبدیلی آنے والی چار صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ہوتی ہے:(۱)کوئی حکم کسی علت پر مبنی تھا، پس جب زمانے کی تبدیلی سے وہ علت ختم ہوگئی تو اس کے ختم ہو جانے کے بناء پر حکم بھی تبدیل ہو گیا۔(۲)حکمِ شریعت عرف اور عادت پر مبنی تھا۔اب اگر عرف تبدیل ہو گیا تو حکم بھی بدل جائے گا اور درحقیقت یہ قسم بھی پہلی صورت ہی کی طرف لوٹتی ہے کیوں کہ عرف کی تبدیلی سے حکم کی تبدیلی تب ہی ہو گی جب گزشتہ حکم کی علت، عرف پر مبنی ہو۔(۳)کبھی حکم کسی سخت ضرورت یا عام ابتلاء (عمومِ بلوی)کی وجہ سے تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ تبدیلی صرف بقدرِ ضرورت ہی ہوتی ہے۔(۴)کبھی حکمِ شریعت سد ذرائع کی وجہ سے تبدیل ہو جاتا ہے۔(اس طرح کے کوئی کام بذاتِ خود تو جائز اور مباح تھا لیکن اس سے اس لئے روک دیا جاتا ہے کہ وہ کسی ممنوع کام تک پہنچنے کا ذریعہ بن رہا ہوتا ہے۔)

لہذا جب کوئی مسئلہ ان چار وجوہ کی بنا پر اتفاقِ ائمہ کے باوجود بھی مختلف ہو جائے تو ایسی صورت میں ائمہ کے متفقہ مذہب کو چھوڑ کر اس قول پر فتوی دیا جائے گا جس قول میں مذکورہ اسباب کی رعایت کی گئی ہو گی۔

تعارض اقوال حنفیہ میں ترجیح قول

جب کسی مسئلہ میں امام ابو حنیفہ سے دو قول یا دو روایتیں مروی ہوں تو ان دونوں میں سے اسے لیا جائے گا جو مؤخر ہو یا اسے لیا جائے گا جس کا اختیار کرنا خود امام ابو حنیفہ سے ثابت ہو اور اگر امام ابو حنیفہ سے کسی قول کی ترجیح بھی ثابت نہ ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا جس کو امام ابو یوسف نے اختیار کیا ہو۔ پھر اس قول یا روایت پر عمل کیا جائے گا جسے امام محمد نے اختیار کیا ہو۔اور پھر اس قول پر عمل کیا جائے گا جس کو امام زفر اور امام حسن بن زیاد نے اختیار کیا ہو۔رہا یہ کہ اگر امام ابو حنیفہ اور صاحبین کی ترجیح کے درمیان اختلاف ہو جائے تو دیکھیں گے اگر مفتی اجتہاد کا اہل ہے تو اسے اختیار دیا جائے گا اور اگر وہ اہلِ اجتہاد میں سے نہیں ہے تو امام ابو احنیفہ کے قول کو اختیار کرے گا۔علامہ شامی فرماتے ہیں کہ جب امام ابو حنیفہ کے ساتھ صاحبین میں سے کوئی ایک موافقت کرے تو اس وقت بھی امام ابو حنیفہ کا قول معتبر ہو گا۔ہاں اگر صاحبین ایک قول پر متفق ہوں اور امام ابو حنیفہ ان سے مختلف مؤقف پر ہوں تو اس صورت میں مفتی مجتہد کو اختیار ہے اور مفتی غیر مجتہد پر امام ابو حنیفہ کے قول کی پیروی لازم ہے ۔اگر تینوں ائمہ کے مختلف اقوال ہوں تو ایسی صورت میں امام ابو حنیفہ کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔[3] اسی طرح کا کلام علامہ ابنِ نجیم نے بھی تتارخانیہ کے واسطہ سے فرمایا ہے۔

وضاحت::علامہ احمد رضا خان[4](م ۱۹۲۱ء) نے علامہ شامی کی اس بات سے اختلاف فرمایا ہے کہ جب امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے قول کی ترجیح میں اختلاف ہو جائے تو مفتی مجتہد کو اختیار ہے کہ وہ جس پر چاہے عمل کرے، مفتی احمد رضا خان فرماتے ہیں کہ ہر حال میں قولِ امام ابو حنیفہ پر عمل کیا جائے گا سوائے اسباب ستہ کے پائے جانے کے وقت۔جب اسبابِ ستہ پائے جائیں گے تو اس صورت میں مشائخ کی ترجیح پر عمل کیا جائے گا۔آپ نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے، جس کا نام آپ نے

"اجلی الاعلام ان الفتوی علی قول الامام" رکھا۔ اس تحقیقی رسالہ میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے کہ فتوی قولِ امام پر ہی ہو گا سوائے چند مخصوص صورتوں کے۔ آپ اس رسالے میں تفصیلی گفتگو فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

"فقد ظهر و لله الحمد ان الترجيح بكون القول قول الامام لايوازيه شئ و اذا اختلف الترجيح وكان احدهما قول الامام فعليه التعويل وكذا اذا لم يكن ترجيح فكيف اذا اتفقو على ترجيحه فلم يبق الاما اتفقوا فيه على ترجيح غيره۔"[5]

مولانا احمد رضاخان فرماتے ہیں کہ اس تفصیل سے بحمد اللہ تعالی روشن ہو گیا کہ کسی قول کے قولِ امام ہونے کے باعث ترجیح پانے کے مقابل کوئی چیز نہیں اور جب اختلافِ ترجیح کی صورت میں دو قولوں میں سے ایک قولِ امام ہو تو اسی پر اعتماد ہے اسی طرح اس وقت بھی جب کوئی ترجیح ہی موجود نہ ہو، پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب سب اسی کی ترجیح پر متفق ہوں تو اب کوئی صورت باقی نہ رہی سوا اس کے کہ جس میں دوسرے کی ترجیح پر سب متفق ہوں۔ اگر علامہ ابن عابدین شامی کا کلام اس پر محمول کر لیا جائے جو ہم نے بیان کیا تو اس صورت میں وہ بلاشبہ حاصل حکم کے لحاظ سے صحیح ہو گا کیوں ہم بھی اس پر ان کی موافقت کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں ہم اسی کو لیں گے جس کی ترجیح پر مشائخ حنفیہ کا اتفاق ہے، البتہ ہمارے اور ان کے درمیان طریقے حکم کا فرق رہ جاتا ہے۔ انہوں نے اس حکم کو اتباع مرجحین کی بنیاد پر اختیار کیا ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسا اسباب ستہ میں سے کسی ایک کے پائے جانے ہی کے موقع پر ہو گا تو یہی امام کا قول ضروری ہو گا اگرچہ وہ ان کے قولِ صوری کے برخلاف ہو بلکہ ہمارے یہاں بعض صورتوں میں تقلیدِ مشائخ کی بھی گنجائش ہے۔

اسبابِ ستہ

وہ چھ اسباب جن کی بنیاد پر قولِ امام ابو حنیفہ کو چھوڑ کر اس کے خلاف پر فتوی دیا جاتا ہے، ان کو بیان کرتے ہوئے معاصر حنفی فقیہ احمد رضاخان فرماتے ہیں: "و مثل ذلک یقع فی اقوال الائمۃ اما لحدوث ضرورۃ او حرج او عرف و تعامل او مصلحۃ مھمۃ تجلب او مفسدۃ تسلب و ذلک لان استثناء الضرورات و رفع الحرج و مراعاۃ المصالح الدینیۃ الخالیۃ عن مفسدۃ تربو علیھا"[6] (اسی طرح اقوال ائمہ میں بھی ہوتا ہے کہ ان کے حکم صوری کے خلاف کوئی حکم ضروری پالیا جاتا ہے۔ اس کے درج ذیل اسباب پیدا ہوتے ہیں (۱) ضرورت (۲) حرج (۳) عرف (۴) تعامل (۵) کوئی مصلحت جس کی تحصیل مطلوب ہے۔ (۶) کوئی بڑا مفسد جس کا ازالہ مطلوب ہے۔)

اصحابِ ترجیح کا مذہب اور اصحابِ ترجیح کا سکوت

امت مسلمہ کا یہ اعجاز ہے کہ اس میں ہر زمانے کے علمی حلقوں میں ایسی نابغہ روز گار شخصیات موجود رہی ہیں جس کے سبب لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے شکوک وشبہات مرتفع ہوتے رہے ہیں۔ مختلف فیہ اقوال کے درمیان ترجیح دینے کا کام بھی ان افراد کے اہم ترین کارناموں میں شامل ہے۔ ایسے افراد کا قول حرفِ آخر تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اصحاب ترجیح کہلاتے ہیں۔

اصحاب ترجیح کا مذہب

اصحابِ ترجیح ایسے علماء ہوتے ہیں جو ائمہ مذہب کے دلائل سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی علل سے بھی واقفیت تامہ رکھتے ہیں۔ جب یہ کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس کی بنیاد پر یہ کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہذا مفتی مقلد پر لازم ہے کہ وہ صرف انہی اقوال پر فتوی دے گا، جنہیں مشائخ حنفیہ میں سے اصحابِ ترجیح نے ترجیح

دی ہو اور اس کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر دلیل راجح دیکھے اور اصحابِ ترجیح کی ترجیح کا لحاظ کیے، جس قول پر چاہے فتوی صادر کرے، کیوں کہ یہ تشاہی بالا قوال ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔ علامہ قاسم بن قطلوبغا فرماتے ہیں: "اتباع الهوى حرام، والمرجوح في مقابلة الراجح بمنزلة العدم، والترجيح بغير مرجح في المتقابلين ممنوع۔" (خواہشات کی پیروی حرام ہے، مرجوح قول ،راجح قول کے مقابلے میں بمنزلہ عدم کے ہے، اور دو متقابل اقوال میں بغیر کسی ترجیح کے سبب کے ترجیح دینا ممنوع ہے۔) لہذا اصحابِ ترجیح نے جس قول کو راجح قرار دے دیا ہے، اس قول پر فتوی دینا اور عمل کرنا لازمی ہے۔

اصحابِ ترجیح کے قول کو فوقیت دینے کی وجہ

اصحابِ ترجیح کے قول کو فوقیت اس لئے حاصل ہے کہ یہ ایسے علماء ہوتے ہیں جو ائمہ مذہب کے دلائل سے بھی واقف ہوتے ہیں اور ان کی علل سے بھی واقفیت تامہ رکھتے ہیں، اس کے باوجود جب یہ کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ مذہبِ ائمہ کے قول سے روگردانی کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے ایسا کرنے کی وجہ جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی نے فرمایا، یہ ہے:

> "أن المشائخ اطلعوا على دليل الامام ،وعرفوا من أين قال ،واطلعوا على دليل أصحابه ،فيرجحون دليل أصحابه على دليله ،فيفتون به ،ولا يظن بهم أنهم عدلوا عن قوله لجهلهم بدليله ،فانا نراهم قدشحنوا كتبهم بنصب الادلة ،ثم يقولون :"الفتوى على قول ابى يوسف " مثلا ـوحيث لم نكن نحن أهلا للنظر فى الدليل ،ولم نصل الى الانهم هم أتباع المذهب الذين نصوا أنفسهم لتقريره و تحريره باجتهادهم ـ"[7]
>
> بے شک مشائخ امام صاحب کی دلیل سے آگاہ تھے اور انہیں معلوم تھا کہ امام صاحب نے یہ بات کس بناء پر کہی ہے؟ اسی طرح یہ فقہاء امام صاحب کے شاگردوں کی دلیل بھی جانتے تھے۔ تو کبھی انہوں نے شاگردوں کی دلیل کو امام صاحب کی دلیل پر ترجیح دے کر اس کے مطابق فتوی دیا ہے۔ ان فقہاء کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے امام صاحب کے قول کو صرف اس لیے چھوڑ دیا ہو گا کہ یہ ان کی دلیل سے ناواقف تھے۔ کیوں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتابوں کو دلائل کے بیان سے لبریز کر دیا ہے اور پھر وہ فرماتے ہیں مثلا "فتوی یہاں امام ابو یوسف کے قول پر ہے" (تو ان کی یہ بات بے بنیاد نہیں ہو سکتی۔ جب کہ ہم لوگ دلیل میں غور و فکر کرنے کے اہل نہیں ہیں اور نہ ہی ہم لوگ تفریعات قائم کرنے میں اور اصول کی معرفت میں ان حضرات کے مرتبہ تک پہنچ سکتے ہیں، تو ہم پر لازم کہ جو مسئلہ جیسے انہوں نے لکھ دیا ہے، ویسے ہی اس کو نقل کر دیں، کیوں کہ یہ حضرات مذہب کے ایسے پیروکار تھے جنہوں نے اجتہاد کے ذریعے مذہب کی تائید اور تہذیب کی خاطر خوب مشقت اٹھائی تھی۔

علامہ شامی کی عبارت سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ اصحابِ ترجیح کی دو صفات ہوتی ہیں: (۱) ان حضرات نے اپنے آپ کو مذہبِ حنفی کی تنقیح اور تحریر کے لئے کھپا دیا تھا۔ (۲) یہ حضرات ان اہلِ اجتہاد میں سے تھے، جو امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کی اس بات کے مخاطب تھے: "لایحل لاحد ان یفتی بقولنا حتی یعلم من این قلنا" (کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتوی دے، جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہم نے یہ قول کس دلیل کی بنیاد پر اختیار کیا ہے۔) اور اس بنیاد پر کہ

امام ابو حنیفہ کے شاگردوں کے تمام اقوال امام صاحب سے بھی روایت ہیں، تو یہ اہلِ ترجیح ان اقوال میں سے اس قول کو لے لیتے ہیں، جس کی دلیل ان کے نزدیک راجح ہوتی ہے۔ تو وہ مسئلہ جسے یہ فقہاء ترجیح دے دیں مفتی مقلد پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اسی کی پیروی کرے۔ خواہ جس قول کو ترجیح دی گئی ہے وہ امام ابو حنیفہ کا قول ہو یا آپ کے تلامذہ میں سے کسی کا قول ہو۔ یہ حضرات کبھی تو صاحبین کے مذہب کو ترجیح دیتے ہیں، کبھی صاحبین میں سے ایک کے مذہب کو دوسرے کے مذہب پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ بعض مسائل میں تو فقہاء نے امام زفر کے قول کو ترجیح دی ہے، بیس مسائل ایسے ہیں جن میں امام زفر کے قول کو ترجیح حاصل ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی نے ان مسائل کو ذکر کر کے اشعار کی شکل میں "ردالمحتار" کے "باب النفقہ" میں تحریر فرمایا ہے۔ جس مسئلہ کو اصحابِ ترجیح نے ترجیح دی ہو وہ بقیہ تمام اقوال پر مقدم ہو گا۔ کیوں کہ ان فقہاء نے باوجود انتہائی تقوی اور مذہبِ حنفی کے التزام کے، جب اس قول کو ایسے اسباب کی بناء پر جو ان کے سامنے واضح ہو چکے تھے ترجیح دی ہے، تو ان کی ترجیح پر ہی عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ اسبابِ ترجیح، دلیل کی قوت، لوگوں کی ضرورت، زمانے کی تبدیلی اور عرف وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ اس بناء پر مرجوح قول کے مطابق عمل کرنا یا فتوی دینا جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ کسی ماہر مفتی کے سامنے کوئی ضرورت ثابت ہو جائے۔ مفتی قاسم صاحب اپنی کتاب "آداب فتوی" میں فرماتے ہیں: "ضرورت کی صورت میں ضعیف قول پر عمل بھی ہو سکتا ہے اور اس پر فتوی بھی دے سکتے ہیں اور قاضی کے فیصلہ کرنے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر قاضی مجتہد ہے تو اس اجتہاد کے مطابق عمل کرے اور اگر قاضی مقلد ہے تو اپنے مذہب کے راجح قول پر ہی فیصلہ کرے۔"[8] یہ بات یاد رہے کہ جو مفتی مقلد ہو، اس پر واجب ہے کہ وہ اقوال اور روایات میں سے صرف انہی کو لے، جن کی تصحیح اصحابِ ترجیح کر چکے ہیں۔ باقی رہے کتب فقہ میں پائے جانے والے وہ ضعیف اقوال اور روایات، جن کے ضعیف ہونے کے بارے میں اصحابِ ترجیح تصریح کر چکے ہیں یا ان کا ضعیف ہونا، ان فقہاء کی عبارتوں سے ضمناً اور التزاماً ثابت ہو رہا ہے، تو ایسی روایات اور اقوال پر عمل کرنا اور فتوی دینا جائز نہیں ہے۔ علامہ قاسم قطلوبغا کا قول نقل کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

> أن الحكم والفتيا بما هو مرجوح خلاف الاجماع ،وأن المرجوح فى مقابلة الراجح بمنزلة العدم ،والترجيح بغير مرجح فى المتقابلات ممنوع ،و أن من يكتفى بأن يكون فتواه أو علمله موافقا لقول أو وجه فى المسألة ،ويعمل بماشاء من الاقوال و الوجوه من غير نظر فى الترجيح ،فقد جهل و خرق الاجماع۔"[9] (بے شک مرجوح قول پر حکم صادر کرنا یا فتوی دینا، خلافِ اجماع ہے۔ اور مرجوح قول، راجح قول کے مقابلے میں ایسا ہوتا ہے گویا کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ اور بغیر کسی وجہ ترجیح کے، آپس میں متعارض اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دے ڈالنا ممنوع ہے۔ اور جو شخص اس پر اکتفاء کر لیتا ہے کہ اس کا فتوی یا اس کا عمل، اس مسئلہ میں کسی بھی قول یا صورت کے موافق ہو جائے (بغیر ترجیح راجح کے) اور وہ مختلف اقوال اور صورتوں کے درمیان ترجیح پر نظر کئے بغیر ہی ان میں سے جس پر چاہے عمل پیرا ہو جائے تو اس نے جہالت کا ارتکاب کیا اور اجماع کی خلاف ورزی کی۔)

بہت سے فقہاء کرام نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ کبھی کسی ایسی ضرورت کی بناء پر جو کسی ضعیف روایت یا مرجوح قول پر عمل کرنے کا تقاضا کرے، ایسا کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ صرف خواہشاتِ نفسانی کی بناء پر ضعیف اقوال کو لینا جائز نہیں ہے لیکن

جب کسی شخص کو کوئی شدید حاجت پیش آجائے تو اس کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ اپنی ذات کی حد تک کسی ضعیف قول یا مرجوح روایت پر عمل کرلے۔ مفتی قاسم صاحب نے "آداب فتوی" میں فرماتے ہیں:

> "علامہ سبکی نے فرمایا کہ ضعیف قول پر فتوی دینے کی تو اجازت نہیں لیکن عمل کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن علامہ ابن حجر مکی کے فتاوی میں لکھا ہے کہ نہ فتوی دینے کی اجازت ہے اور نہ عمل کرنے کی۔ علامہ سبکی کے کلام کے پیش نظر علامہ شرنبلالی نے فرمایا کہ فقہ شافعی میں اجازت ہے اور فقہ حنفی میں اجازت نہیں۔ علامہ شامی اس طرح کے تمام اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ان اقوال کو یوں آپس میں جمع کرسکتے ہیں کہ بوقتِ ضرورت تو ضعیف قول پر عمل کرنے کی اجازت ہے لیکن بلاضرورت عمل کرنے کی اجازت نہیں یعنی تشہی کی صورت میں اجازت نہیں اور تشہی یہ کہ جب چاہا جس قول پر چاہا عمل کرلیا۔"[10]

شدید حاجت پڑنے کی امثلہ کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ کم از کم ضرورت کے وقت مرجوح روایت پر عمل کی اجازت کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل مسئلہ میں طرفین (امام ابو حنیفہ اور امام محمد) کا امام ابو یوسف کے ساتھ وجوب غسل میں اختلاف ہے۔ علامہ مرغینانی غسل کے واجب ہونے کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ثم المعتبر عند ابی حنیفہ و محمد انفصالہ عن مکانہ علی وجہ الشھوۃ وعند ابی یوسف ظھورہ ایضا اعتبارا للخروج بالمزایلۃ اذ الغسل یتعلق بھما ولھما انہ متی وجب من وجہ فالاحتیاط فی الایجاب۔"[11] (پھر امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک غسل کے واجب ہونے کے لئے منی کا اپنی جگہ سے شہوت کے ساتھ جدا ہونا کافی ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک غسل کے واجب ہونے کے لئے منی کا شہوت کے ساتھ ظاہر ہونا بھی ضروری ہے کیوں کہ زائل ہونے کے ساتھ خروج کے لئے اعتبار کیا گیا ہے اس لئے کہ غسل کا تعلق دونوں کے ساتھ ہے۔ طرفین کی دلیل یہ کہ جب غسل من وجہ واجب ہو گیا ہے تو واجب قرار دینے میں احتیاط ہے۔) احناف کے ہاں مفتی بہ مسئلہ یہ ہے کہ جب منی اپنے اصل مقام سے شہوت کے ساتھ جدا ہو گئی، تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ عضو سے خروج منی کے وقت شہوت ختم ہو چکی ہو یا نہیں، دونوں صورتوں میں یہی حکم ہے۔ لہذا اگر کسی شخص کو احتلام کا احساس ہوا اور اس نے اپنے ذکر کو پکڑ لیا، یہاں تک کہ شہوت ختم ہو گئی، پھر اس نے اسے چھوڑ دیا اور منی، شہوت کے ٹھنڈے پڑ جانے کے بعد نکلی تو بھی امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک غسل واجب ہو جائے گا۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ غسل صرف اسی صورت میں لازم ہو گا، جب شہوت، منی نکلتے وقت بھی باقی ہو۔ اصحاب ترجیح نے اس مسئلے میں طرفین کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ لہذا امام ابو یوسف کے قول پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مسافر ہو یا ایسے لوگوں کے ہاں مہمان ہو، جن سے اسے شک و شبہ میں پڑنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں اس کے لئے گنجائش ہے کہ وہ امام ابو یوسف کے قول پر عمل کرلے۔ علامہ ابنِ عابدین شامی فرماتے ہیں:

> "انهم أجازو للمسافر و الضيف الذى خاف الريبة أن يأخذ بقول أبى يوسف بعدم وجوب الغسل على المحتلم الذى امسک ذکرہ عند ما أحس بالاحتلام الى أن فترت شهوته ثم ارسله ،مع ان قوله هذا خلاف الراجح فى المذهب ،لكن اجازوا الاخذبه للضرورة۔"[12] (بے شک فقہاء نے مسافر اور مہمان کے لئے جس کو شک و شبہ میں پڑنے کا خوف ہو، احتلام کی صورت میں غسل کے واجب ہونے میں امام ابو یوسف کے قول پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ احتلام کے وقت محتلم (جس کو احتلام ہو رہا ہو) جب اس کو احتلام ہونا

محسوس ہو وہ اپنے عضو تناسل کو پکڑ لے شہوت کے ٹھنڈا ہونے کے بعد چھوڑ دے۔ یہ قول اگرچہ راجح مذہب کے خلاف ہے لیکن ضرورت کے وقت اس قول کو لینے کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔)

خلاصہ کلام یہ ہے مفتی مقلد اصحاب ترجیح کے ترجیح دیئے گئے مسائل پر فتوی دے گا۔ اس سے روگردانی نہیں کر سکتا سوائے مفتی مجتہد بوقتِ ضرورت راجح قول کو چھوڑ کر مرجوح قول پر عمل کی گنجائش رکھتا ہے۔ جہاں تک مرجوح قول پر فتوی دینے کا معاملہ ہے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ علامہ شامی کے نزدیک راجح یہ ہے عند الضرورت فتوی بھی دیا جاسکتا ہے اور ضرورت نہ ہونے کی صورت میں نہ عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر فتوی دے سکتے ہیں۔

الفاظِ ترجیح

جیسا کہ ما قبل مذکور ہوا کہ وہ مفتی جو مقلد ہو، وہ صرف انہی اقوال پر فتوی دے گا، جنہیں مشائخ حنفیہ میں سے اصحابِ ترجیح نے ترجیح دی ہو اور وہ مرجوح اقوال کو نہیں لے گا۔ اصحابِ ترجیح جب کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں، تو ان کی ترجیح مختلف ہوتی ہے ۔ کبھی تو ترجیح صریح ہوتی ہے اور کبھی ترجیح التزامی ہوتی ہے۔

قاعدہ: ترجیحِ صریح کو ترجیح التزامی پر فوقیت حاصل ہے۔ جب ترجیح صریح پائی جائے تو اسی پر عمل کریں گے اور اس کی عدم موجودگی میں ترجیحِ التزامی پر عمل کیا جائے گا۔

ترجیح کی اقسام

ترجیح کی دو قسمیں ہیں۔(۱) ترجیح صریح، (۲) ترجیح التزامی

ترجیح صریح کی وضاحت

یہ وہ ترجیح ہے جو بلکل واضح اور صریح الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے۔ جیسے فقہاء کہتے ہیں ھو الصحیح، ھو الاصح وغیرہ۔

ترجیحِ صریح کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ کے مراتب

صریح ترجیح کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ تمام درجے اور قوت کے اعتبار سے برابر نہیں بلکہ ان میں سے کچھ دوسروں کی نسبت زیادہ قوت رکھتے ہیں۔ ان الفاظ میں سب سے قوی علیہ عمل الامۃ ہے۔ پھر علیہ الفتوی اور بہ یفتیٰ۔ پھر الفتوی علیہ، پھر ھو الصحیح یا ھو الاصح ہے، پھر باقی تمام الفاظ قوتِ تصحیح کے اعتبار سے برابر ہیں۔ جیسے ھو المعتمد اور ھو الاشبہ۔ البتہ ان میں جو اسم تفضیل کے صیغے ہوں گے، وہ دیگر صیغوں کی نسبت راجح ہوں گے۔[13]

ترجیح التزامی

ترجیح التزامی صریح الفاظ سے نہیں ہوتی بلکہ اس پر مؤلفِ کتاب یا کسی معروف مفتی کا مخصوص اور مشہور طرز دلالت کرتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) پہلی صورت: قولِ راجح کو مقدم کرنا۔ **(۲) دوسری صورت**: ترجیحِ التزامی کی دوسری صورت یہ قول راجح کی دلیل کو مؤخر کرنا۔ **(۳) تیسری صورت**: صرف قولِ راجح کی دلیل ذکر کرنا۔ **(۴) چوتھی صورت**: کسی فقیہ کا چند اقوال نقل کرنے کے بعد ایک قول کے علاوہ دیگر اقوال کے دلائل کا رد کرنا بھی ترجیح التزامی ہے۔ **(۵) پانچویں صورت**: کسی قول کا متونِ معتبرہ میں مذکور ہونا۔ مثلاً کسی فقیہ نے چند اقوال نقل کئے، ان میں سے ایک قول ایسا ہے جو معتبر متون میں مذکور ہے۔ متونِ معتبرہ میں مذکور ہونا یہ بات بتانے کے لئے کافی ہے کہ یہ قول مذہبِ حنفی میں راجح ہے، اگرچہ وہاں اس کی ترجیح کی کوئی صراحت نہ کی گئی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ متون، مذہب کے راجح اقوال کو جمع کرنے کے لئے ہی لکھے گئے ہیں۔ متونِ معتبرہ کو بیان کرتے ہوئے علامہ ابنِ عابدین شامی فرماتے ہیں: "ثم لا یخفی ان المراد بالمتون، المتون المعتبرۃ ک "البدایۃ" و "مختصر القدوری"، و

"المختار"، و"النقایۃ"، و"الکنز"، و"الملتقی"، فانها الموضوعۃ لنقل المذھب مماھو ظاھر الروایۃ،"[14] (پھر یہ بات مخفی نہ رہے کہ متون سے مراد، متونِ معتبرہ ہیں جیسے "ہدایہ"، "مختصر القدوری"، "مختار"، "نقایہ"، "کنز" اور "ملتقی"۔ پس بے شک یہ متونِ معتبرہ نقلِ مذہب کے لئے لکھے گئے ہیں ان مسائل میں سے جو ظاہر الروایہ میں ہیں۔)

مفتی محمد قاسم صاحب نے متونِ معتبرہ میں علامہ شامی سے کچھ اضافہ کرکے بیان کیا ہے۔ ان متون میں "مختصر امام طحاوی"، "مختصر امام کرخی"، "وافی"، "اصلاح، مجمع البحرین" اور "مواہب الرحمن" کا اضافہ کیا ہے۔[15]

قاعدہ

جو روایت متونِ معتبرہ میں ہو، وہ روایت اس پر مقدم ہوگی جو شروح میں مذکور ہے۔ اسی طرح جو روایت شروحاتِ حنفیہ میں ہے، یہ اس روایت پر مقدم ہوگی جو کتب فتاوی میں مذکور ہے۔ متون معتبرہ کا مختصر تعارفی جائزہ درج ذیل ہے۔

معتبر متون

البدایۃ، مختصر القدوری، المختار، النقایۃ، الوقایہ، الکنز الدقائق، ملتقی الابحر، مختصر امام طحاوی، مختصر امام کرخی، الوافی، اصلاح، مجمع البحرین، مواہب الرحمٰن۔

علامہ قاسم قطلوبغا فرماتے ہیں: "جو اقوال متون میں مذکور ہوں تو یہ ان کے لئے ترجیحِ التزامی ہے۔"[16]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ترجیح صریح کے ہوتے ہوئے ترجیحِ التزامی کو فوقیت حاصل نہیں ہوگی۔ ترجیحِ صریح پر ہی عمل کیا جائے گا۔

ترجیحات کا تعارض اور وجوہ ترجیح

اگر دو قول متعارض ہوں اور ان میں سے ہر ایک کو ترجیح دی گئی ہے تو اگر دونوں ترجیحات ایک ہی شخص کی طرف سے ہیں تو متاخر ترجیح پر عمل ہوگا اور اگر تاریخ معلوم نہ ہو یا دونوں ترجیحات دو الگ الگ شخصوں کی طرف سے ہیں تو مفتی ان میں سے ایک کو ترجیح دے گا، ایسی وجوہ ترجیح کو مدنظر رکھ کر جو اس کے سامنے واضح ہوں۔ پس اگر ان دونوں اقوال کے لئے وجوہ ترجیح میں سے کوئی بھی واضح نہ ہو تو مفتی کو اختیار ہوگا کہ وہ ان میں سے ایک قول کو لے، اپنے دل کی گواہی کے ساتھ، نفسانی خواہشات سے بچتے ہوئے اور اللہ تعالی سے صواب (یعنی درست) بات کو طلب کرتے ہوئے۔

اہم وجوہ ترجیح درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر دو تصحیحات میں سے ایک صریح اور دوسری التزامی ہو تو صریح پر عمل کیا جائے۔ مثال کے طور ایک مسئلہ میں ایک فقیہ نے صراحت لفظِ "اصح" استعمال فرمایا ہے۔ اور یہی مسئلہ متونِ معتبرہ میں اس فقیہ سے مختلف درج ہے تو فقیہ کی تصحیح کا اعتبار ہوگا۔ متونِ معتبرہ کو چھوڑ دیا جائے گا۔

۲۔ اگر دو تصحیحوں میں سے ایک ایسے لفظ کے ساتھ ہو جو دوسری تصحیح کی نسبت زیادہ قوی ہے تو قوی لفظ والی تصحیح کو ترجیح دی جائے گی۔ مثال کے طور پر ایک تصحیح میں "علیہ عمل الامہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دوسری تصحیح میں "بہ یفتی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں "علیہ عمل الامہ" کو ترجیح دی جائے گی کیوں یہ تصحیح بنسبت "بہ یفتی" سے قوی ہے۔ اسی طرح مراتب الفاظ کو دیکھ کر فتوی دیا جائے گا۔ ان الفاظ کے مراتب کو ماقبل میں بیان کیا جاچکا ہے۔

۳۔ اگر دو تصحیحوں میں سے ایک متون میں مذکور ہے اور دوسری غیر متون میں تو جو تصحیح متون میں ہوگی وہ راجح ہوگی سوائے اس صورت کہ جب اصحاب الترجیح میں سے کسی فقیہ نے غیر متون کے راجح ہونے کی صراحت کردی ہو۔ مثلاً اگر مسئلہ کی تصحیح "وقایہ" میں ہے اور اس کے خلاف قول کی تصحیح "فتح القدیر" میں امام ابنِ ہمام نے کی ہے۔ اس میں "وقایہ" کی تصحیح کو ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ ترجیح کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ اگر ایک تصحیح ظاہر الروایۃ میں ہے اور دوسری تصحیح ظاہر الروایۃ کے علاوہ کسی کتاب میں ہے تو راجح وہ ہوگی جو ظاہر الروایۃ میں ہے۔

۵۔ اگر دو تصحیحوں میں سے ایک امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور دوسرا صاحبین کا قول ہے تو راجح امام ابو حنیفہ کا قول ہوگا۔ امام احمد رضاخان فرماتے ہیں: "اذا اختلف التصحیح تقدم قول الامام"[17] (جب تصحیح میں اختلاف ہو تو قولِ امام کو مقدم کیا جائے گا۔)

۶۔ اگر دو قول ہیں، ایک اکثر مشائخ کا ترجیح یافتہ ہے اور دوسرا قول بعض مشائخ کا ترجیح یافتہ ہے تو راجح وہ قول ہوگا جس کی طرف اکثر مشائخ کی رائے ہے۔

۷۔ اگر کسی مسئلہ میں دو قول متعارض ہیں۔ ان دو قولوں میں سے ایک کی بنیاد قیاس پر ہے اور دوسرے کی استحسان پر ہے تو راجح استحسان والا قول ہوگا۔

۸۔ اگر ان اقوال میں سے ایک حالاتِ زمانہ کے زیادہ موافق ہے تو اس قول کو ترجیح حاصل ہوگی بنسبت اس قول کے جو حالاتِ زمانہ کے زیادہ موافق نہیں ہے۔

۹۔ اگر مختلف اقوال میں سے ایک قول کسی ایسے صاحبِ نظر مفتی کے نزدیک جو دلائل سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہو تو وہ قول دیگر اقوال کی بنسبت اولی ہے۔

۱۰۔ جب دو قولوں میں سے ایک قول "انفع للفقراء" یعنی فقیر کے لئے زیادہ نفع مند ہو، تو وہ باب الزکاۃ میں راجح ہوگا۔

۱۱۔ اگر دو قولوں میں سے "انفع للوقف" یعنی وقف کی اشیاء کے لئے زیادہ فائدے مند ہو تو وہ دیگر کی بنسبت اولی ہوگا۔

۱۲۔ اگر دو قولوں میں سے ایک حدِ شرعی کو ساقط کرنے والا ہو تو وہ راجح ہوگا بنسبت اس قول کے جو حدِ شرعی کو ثابت کرتا ہے۔

۱۳۔ جب تعارض حلت اور حرمت کے درمیان ہو تو راجح وہ قول ہوگا جو حرام قرار دینے والا ہو۔

۱۴۔ معاملات میں ایسر (یعنی زیادہ آسان) کو لیا جائے گا۔

۱۵۔ عبادات میں احوط (یعنی زیادہ احتیاط والا قول) کو ترجیح دی جائے گی۔

علامہ ابنِ عابدین شامی نے "عقود رسم المفتی" میں مذکورہ قواعد کے علاوہ بھی چند ایسے ضابطے بھی ذکر کیے ہیں، جن سے فتوی دیتے وقت مدد کی جاسکتی ہے۔ وہ ضابطے یہ ہیں:

ا۔ عبادات میں مطلقاً حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کو لیا جائے گا۔ علامہ شامی فرماتے ہیں: "فی کل ابواب العبادات رجح قول الامام مطلقا مالم یصح عنہ روایۃ بھا الغیر اخذ"[18] (عبادات کے تمام ابواب میں قول امام کو مطلق ترجیح حاصل ہے جب تک اس کے علاوہ قول کی تصحیح نہ آجائے۔) اس قاعدہ کی مثال وہ مسئلہ ہے جو علامہ برہان الدین مرغینانی نے ہدایہ میں ماء مستعمل کے پاک ہونے کے بارے میں نقل فرمایا ہے۔ اس مسئلہ میں امام زفر اور امام ابو حنیفہ کا آپس میں اختلاف ہے۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ اگر اس پانی کو استعمال کرنے والا متوضی ہے تو یہ پانی طہور ہے اور اگر استعمال کرنے والا محدث ہے تو یہ پانی پاک ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ پانی نجس ہے کیوں کہ حدیث میں ہے "لا یبولن احدکم فی الماء الدائم ولا یغتسلن فیہ من الجنابۃ۔" (تم میں سے کوئی بھی کھڑے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے اور نہ ہی جنابت سے غسل کرے۔) اس کے بعد امام ابو حنیفہ نے عقلی دلیل دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ چوں کہ اس پانی کے ساتھ نجاست حکمیہ کو زائل کیا گیا ہے تو اس میں اس پانی کا اعتبار کیا جائے گا جس کے ساتھ نجاست حقیقی کو زائل کیا گیا ہو۔ علامہ برہان الدین فرماتے ہیں:

> "قال زفر و ھو احد قولی الشافعی ان کان المستعمل متوضیا فھو طھور و ان کان محدثا فھو طاہر غیر طھور لان العضو طاہر حقیقۃ و با عتبارہ یکون الماء طاھرا

لکنه نجس حکما و باعتباره یکون الماء نجسا فقلنا بانتفاء الطهورية و بقاء الطهارة عملا بالشبهتین "[19] (امام زفر فرماتے ہیں اور یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے اگر استعمال کرنے والا شخص باوضو ہو تب تو وہ پانی طہور ہے، لیکن اگر پانی کو استعمال کرنے والا محدث ہو تب پانی طاہر ہے، طہور نہیں ہے، اس لیے کہ عضو حقیقۃ طاہر ہے، لہذا اس اعتبار سے پانی بھی طاہر ہو گا، لیکن حکما وہ نجس ہے اور اس اعتبار سے پانی ناپاک ہو گا، اس لئے دونوں مشابہتوں پر عمل کرتے ہوئے ہم طہوریت کی انتفاء اور طہارت کی بقاء کے قائل ہیں۔)

۲۔ قضاء کے مسائل میں امام ابو یوسف کے قول کو لیا جائے گا۔ علامہ شامی اپنی منظومہ میں فرماتے ہیں: "و کل فرع بالقضا تعلقا قول ابی یوسف فیہ ینتقی "[20] (ہر وہ مسئلہ جس کا تعلق قضاء سے ہو اس میں امام ابو یوسف کے قول کا انتخاب کیا جائے گا۔) قضاء سے متعلق مسائل میں امام ابو یوسف کی رائے اس لئے راجح قرار دی جاتی ہے کہ آپ عہدہ قضاء پر فائز رہے ہیں اور آپ اس کا بہت زیادہ تجربہ رکھتے تھے۔

۳۔ ذوی الارحام رشتے داروں کو وارث بنانے کے مسئلے میں امام محمد کے قول کو لیا جائے گا۔ اس کی مثال وہ مسئلہ ہے جس میں امام ابو یوسف اور امام محمد کا اختلاف ہے کہ امام ابو یوسف کے نزدیک وراثت کی تقسیم حصص کی بنیاد پر ہو گی۔ اور امام محمد کے نزدیک وراثت کی تقسیم قیمت کے ذریعے ہو گی۔ علامہ حلبی نے امام محمد کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اسی پر فتوی ہے۔ علامہ حلبی فرماتے ہیں: "وعند أبي يوسف سهما بسهم، وعند محمد يقسم بالقيمة، وعليه الفتوى۔ "[21] (امام ابو یوسف کے نزدیک وراثت کی تقسیم کاری حصوں کے ذریعے ہو گی اور امام محمد کے نزدیک قیمت کے ذریعے ہو گی، اور امام محمد کے قول پر فتوی ہے۔)

۴۔ جب روایت درایت کے موافق ہو تو اس صورت میں روایت معتبر ہو گی۔ ایسی صورت میں فتوی اسی روایت / قول پر ہو گا جس کی عقلی توجیہ زیادہ مضبوط ہو گی۔ اس کی مثال وہ مسئلہ ہے جس کو علامہ حلبی نے "شرح منیہ" میں تعدیل ارکان کے بارے میں نقل فرمایا ہے۔ تعدیل ارکان کے وجوب اور فرض ہونے میں ائمہ احناف کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک فرض ہے اور طرفین یعنی امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک واجب ہیں۔ دونوں کے نقلی دلائل بیان کرنے کے بعد علامہ حلبی نے عقلی دلائل کے موافق طرفین کے دلائل ہونے کی بنا پر ابن ھمام کی ترجیح بیان فرمائی کہ تعدیل ارکان واجب ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

> "اکمال کل رکن واجب عند ابی حنیفة و محمد و عند ابی یوسف و الشافعی فریضة فیمکث فی الرکوع و السجود وفی القومة بیهما حتی یطمئن کل عضو منه هذا الواجب عند ابی حنیفة و محمد حتی لو ترکها او شیأ منها ساهیا یلزمه السهو و لو ترکها عامدا یکره اشد الکراهة و یلزمه ان یعیده الصلوة و تکون معتبرة فی حق سقوط الترتیب و نحوه کمن طاف جنبا یلزمه الاعادة و المعتبر هو الاول۔"[22]

ہر رکن کو مکمل کرنا امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک واجب ہے، امام ابو یوسف اور امام شافعی کے نزدیک فرض ہے۔ پس رکوع، سجدہ اور قومہ میں ان دونوں کے درمیان اس وقت تک ٹھہرے گا یہاں تک کہ ہر عضو مطمئن ہو جائے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک واجب ہے یہاں تک کہ اگر اس نے اس کو چھوڑا یا بھول کر کوئی چیز چھوڑی تو اس پر سجدہ سہو لازم ہو گا اور اگر جان بوجھ کر چھوڑا تو یہ بہت سخت مکروہ ہے اور اس چھوڑنے والے پر لازم ہو گا کہ وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے اور ترتیب کے ساقط

ہونے کے حق میں اس کا اعتبار کیا گیا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جنبی نے طواف کر لیا تو اس پر اس طواف کا اعادہ کرنا لازم ہو گا اور معتبر پہلا قول ہی ہے۔

۵۔ جب تک کسی مسلمان کے کلام کو صحیح معنی پر محمول کرنا ممکن ہو گا، اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی کے کفر میں اختلاف ہو تو بھی اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، اگرچہ عدمِ تکفیر والی روایت ضعیف ہی ہو۔ اس کی مثال وہ مسئلہ ہے جس میں علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں کہ "اگر کسی نے کہا" یا حاضر، یا ناظر "اسی طرح اور اگر کسی نے یہ کہا" درویش درویشان "اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ ان کی تکفیر کا قول کرنا باطل ہے۔ "جامع الفصولین" اور ہمارے اصحاب سے امام طحاوی نے روایت کیا ہے کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک ایمان سے نہیں نکلے گا جب تک اس چیز کا انکار نہ کرے جو ایمان میں داخل ہے۔ اگر کسی نے واضح اور یقینی طور پر انکار کیا تو اس کی تکفیر کی جائے گی اور اگر اس کے انکار میں شک ہو تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی کیوں کہ اسلام ثابت ہے اور یہ شک کے ساتھ زائل نہیں ہو گا۔ فتاوی صغری میں ہے کہ کفر ایک عظیم چیز ہے پس کسی کو اس وقت تک کافر نہیں قرار دیا جائے گا جب کوئی روایت اس کے عدمِ تکفیر کی موجود ہو۔ علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: "وفي الفتاوی الصغری الكفر شيء عظيم فلا أجعل المؤمن كافرا متی وجدت رواية أنه لا يكفر۔"[23] (فتاوی صغری میں ہے کہ کفر ایک عظیم چیز ہے پس عدم تکفیر کی روایت پائے جانے کی صورت میں مومن کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔)

۶۔ جو روایت متونِ معتبرہ میں ہو، وہ روایت، اس روایت پر مقدم ہو گی جو شروح میں مذکور ہے۔ اسی طرح جو روایت شروحاتِ حنفیہ میں ہے، یہ اس روایت پر مقدم ہو گی جو کتب فتاوی میں مذکور ہے۔ فقہ حنفی کے متونِ معتبرہ درج ذیل ہیں:

"مختصر القدوری"، "البدایۃ"، "المختار"، "النقایۃ"، "الوقایۃ"، "کنز الدقائق"، "الملتقی"، "مختصر امام طحاوی"، "مختصر امام کرخی"، "وافی"، "مجمع البحرین" اور "مواہب الرحمٰن" بخلاف ملاخسرو کے متن "الغرر" اور علامہ تمر تاشی الغزی کے متن "التنویر" کے، کیوں کہ ان دونوں کتابوں میں فتاوی کے مسائل کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ یاد رہے کہ یہاں پر جتنے بھی قواعد بیان کیے گئے ہیں اختلاف ائمہ کے وقت ان کو ہر جگہ پر لاگو نہیں کیا جا سکتا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اختلاف ائمہ کے وقت ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ورنہ اصل بات یہ ہے کہ فقہاء کے اقوال میں صحیح معنوں میں ترجیح دینے کے لیے، ایسے ملکہ فقہیہ اور ذوق صحیح کی طرف رجوع کرنا ہے، جو ماہر فقہاء اور مفتیانِ کرام کے پاس طویل مشق اور ان کے پاس رہے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

اصحاب ترجیح کا سکوت

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اختلاف اقوال کے وقت اصحابِ ترجیح نے کسی بھی مؤقف کو ترجیح نہیں دی ہوتی اور اصحابِ ترجیح سے مختلف اقوال میں کسی کی تصحیح نہ پائی جائے تو ظاہر الروایۃ کی پیروی کرنا لازم ہے اور جب ظاہر الروایہ کی دو روایتوں میں اختلاف ہو جائے تو اس روایت پر عمل کیا جائے گا جو زمانے کے لحاظ سے مؤخر ہو۔ لہذا ان دونوں روایتوں کی تاریخ کا جاننا ضروری ہوا۔ اگر روایتوں کی تاریخ معلوم نہ ہو تو ظاہر الروایہ کی اس کتاب میں مذکور قول کو لیا جائے گا جس کی تالیف امام محمد نے بعد میں کی ہو اور اس کے مخالف روایت ایسے ہو جائے گی گویا اس سے رجوع کر لیا گیا ہے۔ لہذا ظاہر الروایۃ کی چھ کتابوں کی تاریخ جاننا ایک لازمی امر ہو گیا۔ امام محمد نے سب سے پہلے "المبسوط" تالیف فرمائی[24] پھر اس کے بعد "الجامع الصغیر" اس کے بعد "الجامع الکبیر" پھر "الزیادات" پھر "السیر الصغیر" اور پھر "السیر الکبیر" تالیف فرمائی ہے۔[25] مثلاً اگر "مبسوط" اور "الزیادات" کے درمیان تعارض واقع ہو تو اس روایت کو لیا جائے گا جو "الزیادات" میں ہے کیوں کہ یہ مؤخر ہے۔ لہذا ظاہر الروایۃ میں اختلاف کے وقت آخر میں لکھی جانے والی کتاب کا قول معتبر مانا جائے گا۔

خلاصۂ بحث

جب کسی مسئلہ میں امام ابو حنیفہ سے دو قول یا دو روایت مروی ہوں تو ان دونوں میں سے اسے لیا جائے گا جو مؤخر ہو یا اسے لیا جائے گا جس کا اختیار کرنا خود امام ابو حنیفہ سے ثابت ہو اور اگر امام ابو حنیفہ سے کسی قول کی ترجیح بھی ثابت نہ ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا جس کو امام ابو یوسف نے اختیار کیا ہو۔ پھر اس قول یا روایت پر عمل کیا جائے گا جسے امام محمد نے اختیار کیا ہو۔ اور پھر اس قول پر عمل کیا جائے گا جس کو امام زفر اور امام حسن بن زیاد نے اختیار کیا ہو۔ رہا یہ کہ اگر امام ابو حنیفہ اور صاحبین کی ترجیح کے درمیان اختلاف ہو جائے تو دیکھیں گے اگر مفتی اجتہاد کا اہل ہے تو اسے اختیار دیا جائے گا اور اگر وہ اہل اجتہاد میں سے نہیں ہے تو امام ابو حنیفہ کے قول کو اختیار کرے گا۔ علامہ ابن نجیم کے کلام سے یہ مستفاد ہے کہ جب امام ابو حنیفہ کے ساتھ صاحبین میں سے کوئی ایک موافقت کرے تو اس وقت بھی امام ابو حنیفہ کا قول معتبر ہو گا۔ ہاں اگر صاحبین ایک قول پر متفق ہوں اور امام ابو حنیفہ ان سے مختلف مؤقف پر ہوں تو اس صورت میں مفتی مجتہد کو اختیار ہے اور مفتی غیر مجتہد پر امام ابو حنیفہ کے قول کی پیروی لازم ہے۔ اگر تینوں ائمہ کے مختلف اقوال ہوں تو ایسی صورت میں امام ابو حنیفہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا۔ ہاں اگر اختلاف کی بنیاد اسبابِ ستہ ہوں تو صاحبین کے قول پر عمل کیا جائے گا کیوں کہ اس صورت میں صاحبین کے قول پر عمل کرنا اور امام صاحب کے قول کو چھوڑ دینا ہی دراصل امام ابو حنیفہ کے مذہب پر عمل ہے۔ صرف انہی الفاظ پر جمے رہنے کا نام مذہب حنفی پر عمل کرنا نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کے قول کو ترک کرنا اور اسبابِ ستہ میں سے کسی ایک کے موافق عمل کرنا امام ابو حنیفہ کے قول ضروری پر عمل کرنا ہے۔ اگر کسی مسئلہ میں اصحاب ترجیح کا قول موجود ہو تو اس قول کو لیا جائے گا، اگر اصحاب ترجیح کے درمیان اختلاف ہو تو ترجیح صریح کو ترجیحِ التزامی پر فوقیت حاصل ہو گی۔ اگر ترجیح کی کوئی وجہ موجود نہ ہو یا اصحابِ ترجیح کسی مسئلہ میں خاموش ہوں تو کتب ظاہر الروایہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اگر کتبِ ظاہر الروایہ میں بھی اختلاف ہو مؤخر روایت پر عمل کریں گے، اگر مؤخر روایت معلوم نہ ہو تو وہ روایت ترجیح پائے گی جو اس کتاب میں مذکور ہو جو لکھے جانے میں مؤخر ہے۔ اگر مسئلہ کتبِ ظاہر الروایہ میں موجود نہ ہو تو پھر کتبِ النوادر اور پھر فتاویٰ وواقعات کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

حوالاجات

[1] طبقاتِ فقہاء اور طبقات مسائل کا استعمال اس وقت کیا جائے گا جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو۔

[2] مفتی محمد تقی عثمانی، اصول الافتاء وآدابہ، (کراچی: مکتبۃ معارف القرآن، الطبعۃ1432ھ)، ص24

[3] سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، شرح عقود رسم المفتی، (کراچی: مکتبۃ البشریٰ، الطبعۃالاولی1430ھ)، ص38

[4] مولانا احمد رضا خان کی پیدائش 10 شوال المکرم 1282ھ میں بریلی شریف میں ہوئی۔ آپ بیسویں صدی عیسوی کے نامور حنفی فقیہ، محدث، اصولی، نعت گو شاعر، علوم نقلیہ وعقلیہ کے ماہر، سلسلہ قادریہ کے شیخ، عربی، فارسی اور اردو کی کثیر کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف میں "ترجمۂ کنز الایمان، ارمغان رضا، العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ، نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان، جد الممتار علی الرد المحتار، الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ، کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم، حدائق بخشش وغیرہ شامل ہیں۔ ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء کو جمعہ کے دن آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ احمد رضا خان کا مزار بریلی شریف میں آج بھی زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔ مولانا الیاس عطار قادری، تذکرہ امام احمد رضا، (کراچی، مکتبۃ المدینہ)، ص2

[5] احمد رضا خان، فتاوی رضویہ، (لاہور: رضا فاونڈیشن جامعہ نظامیہ، طباعت اپریل 2006)، ج1، ص231

[6] احمد رضا خان، فتاوی رضویہ، (لاہور: رضا فاونڈیشن جامعہ نظامیہ، طباعت اپریل 2006)، ج1، ص126

[7] سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، شرح عقود رسم المفتی، (کراچی: مکتبۃ البشری، الطبعۃ الاولی 1430ھ)، ص 45
[8] مفتی محمد قاسم قادری، آداب فتوی، (کراچی: باب الاسلام پبلشرز، سن اشاعت 2015ء)، ص 200
[9] سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، شرح عقود رسم المفتی، (کراچی: مکتبۃ البشری، الطبعۃ الاولی 1430ھ)، ص 84
[10] مفتی محمد قاسم قادری، آداب فتوی، (کراچی: باب الاسلام پبلشرز، سن اشاعت ۲۰۱۵ء)، ص ۲۰۰
[11] برہان الدین ابی الحسن علی بن ابی بکر الفرغانی المرغینانی، الھدیۃ، (لاہور: مکتبہ رحمانیہ)، ج 1، ص 31
[12] سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، شرح عقود رسم المفتی، (کراچی: مکتبۃ البشری، الطبعۃ الاولی 1430ھ)، ص 85
[13] مفتی محمد تقی عثمانی، اصول الافتاء، (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، الطبعۃ 1432)، ص 187
[14] سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، شرح عقود رسم المفتی، (کراچی: مکتبۃ البشری، الطبعۃ الاولی 1430ھ)، ص 40
[15] مفتی محمد قاسم قادری، آداب فتوی، (کراچی: باب الاسلام پبلشرز، سن اشاعت 2015ء)، ص 162
[16] محمد منصور احمد، فتوی تعارف اصول آداب، (ادارۃ المقصود، شعبان 1434ھ)، ص 213
[17] احمد رضا خان، اَجلی الاِعلام اَنّ الفتوٰی مُطلقاً علیٰ قولِ الامام، (لاہور: رضا فاؤنڈیشن)، ج 1، ص 134
[18] سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، شرح عقود رسم المفتی، (کراچی: مکتبۃ البشری، الطبعۃ الاولی 1430ھ)، ص 55
[19] برہان الدین ابی الحسن علی بن ابی بکر الفرغانی، ہدایۃ، (لاہور: مکتبہ رحمانیہ)، ج 1، ص 37
[20] سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، شرح عقود رسم المفتی، (کراچی: مکتبۃ البشری، الطبعۃ الاولی 1430ھ)، ص 55
[21] إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي الحنفي، مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، (بيروت : دار الكتب العلمية ,الطبعة: الأولى 1419ھ)، ج 1، ص 133
[22] إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي الحنفي، غنية المتملي في شرح منية المصلي، (ناشر در سعادت عارف آفندی)، ص 295
[23] زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري، البحر الرائق شرح كنز الدقائق، (الناشر دار الكتاب الإسلامي، الطبعة الثانية)، ج 5، ص 134
[24] ڈاکٹر محمد دسوقی، امام محمد بن حسن اور انی کی فقہی خدمات، (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، 2005)، ص 189
[25] محمد منصور احمد، فتوی تعارف اصول آداب، (ادارۃ المقصود، شعبان 1436ھ)، ص 219